

نئے ادب کے معمار

عصمت چغتائی

از

سعادت حسن منٹو

مکتبہ پبلشرز لمیٹڈ۔ بمبئی ۱

۱۵۲۱۹

سنہ ۱۹۴۸ء

قیمت
پندرہ آنے

فیروز مستری نے قادری پریس نور منزل ۔ محمد علی روڈ بمبئی ۳
سے چھپوا کر کتب پبلشرز لمیٹڈ ریگل بلڈنگ ۱۱ اپولو بندر بمبئی ۱
سے شائع کیا۔

عِصمت چُغتائی

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدر آباد سے ایک صاحب کا پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ اس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"یہ کیا بات ہے کہ عِصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟
منٹو اور عِصمت، اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا
ہوتا مگر افسوس کہ عِصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور منٹو..."

انہی دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی میں اس میں شریک نہیں تھا۔ لیکن حیدر آباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عِصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا "آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی؟"

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط۔ لیکن جب عِصمت بمبئی

واپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدرآباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے سوال کیا "کیا منٹو کنوارا ہے ؟" تو اس نے ذرا طنز کے ساتھ جواب دیا "جی نہیں" اس پر وہ محترمہ عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسیانی سی ہوکر خاموش ہوگئیں واقعات کچھ بھی ہوں۔ لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ سارے ہندوستان میں ایک صرف حیدرآباد ہی ایسی جگہ ہے۔ جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکرمند رہے ہیں۔

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں۔ اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا ؟ یہ "اگر" بھی کچھ اسی قسم کی اگر ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا اٹھارہواں حصہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادیٔ نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا۔ لیکن یہاں نہ تو عصمت قلوپطرہ ہے اور نہ منٹو انطنی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر عہد حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ افسانے افسانے بن جاتے۔ کہانیاں مڑ تڑ کر پہیلیاں ہوجاتیں۔ انشا کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہوکر یا تو ایک نادر سفوف کی شکل اختیار کر لیتا یا بھسم ہوکر راکھ بن جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری تحریر ہوتے۔ لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرین قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے" تاکہ سند رہے

لیکن . . . .

"عصمت، قاضی صاحب کی پیشانی ایسا لگتا ہے تختی ہے"

. . . .

"کیا کہا؟"

"تمہارے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا . . . . . . تمہاری اپنی آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی"

"حد ہو گئی ہے . . . . . . تو اب سنو۔ میں یہ کہہ رہا تھا قاضی صاحب کی پیشانی بالکل تختی سے ملتی جلتی ہے"

"تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے"

"یہ پیشانی سپاٹ نہیں؟"

"تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟"

"جی نہیں"

"سپاٹ ماتھا تمہارا ہے۔ قاضی جی کا ماتھا تو . . . . ."

"بڑا خوبصورت ہے"

"خوبصورت تو ہے"

"تم محض چڑا رہی ہو مجھے!"

"چڑا تم رہے ہو مجھے"

"میں کہتا ہوں تم چڑا رہی ہو مجھے"

"میں کہتی ہوں تم چڑا رہے ہو مجھے"

"تمہیں ماننا پڑے گا کہ تم چڑا رہی ہو مجھے"

"اجی واہ ـــــ تم تو ابھی سے شوہر بن بیٹھے"۔

"قاضی صاحب، میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا ـــــ اگر آپ کی بیٹی کا ماتھا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھوا دیجئے"۔

"قاضی صاحب، میں اس مردوے سے شادی نہیں کروں گی ـــــ اگر آپ کی چار بیویاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجئے۔ مجھے آپ کا ماتھا بہت پسند ہے"۔

کرشن چندر "چوٹیں" کے دیباچے میں لکھتا ہے:۔

عصمت کو چھپانے میں، پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کر دینے میں اور پھر یکایک آخر میں اس اضطراب و حیرت کو مسرت میں مبدل کر دینے کی صفت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگار ان کے حریف ہیں۔

اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دوسروں کو حیرت و اضطراب میں گم کرنے کے بجائے ہم خود اس میں غرق ہو جاتے۔ اور جب ایک دم چونکتے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ مسرت کے بجائے ایک بہت بڑے فکاہیہ میں تبدیل ہو جاتا ـــــ عصمت اور منٹو۔ نکاح اور شادی۔ کتنی مضحکہ خیز چیز ہے۔

عصمت لکھتی ہے

ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت، کتنے محمود، عباس

عسکری، یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح
چھینٹ کر بکھیر دیے گئے ہیں۔ کوئی بتاؤ، ان میں سے چڑ پتا
کون سا ہے؟ ــــــ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں
محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضاء۔ عسکری کے بے رحم
ہاتھ، یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل۔ عباس کی کھوئی ہوئی
مسکراہٹیں اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے۔ کشادہ پیشانیاں
گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں، مضبوط بازو سب ایک ساتھ
مل کر کچے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان
ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا
سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہارے
دور افق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔
(چھوٹی آپا)

منٹو لکھتا ہے:-

میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور زمینیں
خریدنا تمہارے لئے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے
کے بجائے ایک دو بیگھے زمین خرید لو اور اس پر ساری عمر
قابض رہو ــــــ زندگی میں صرف ایک عورت ــــــ اور
یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے؟ ــــــ کیوں اس میں اتنے
تماشے جمع ہیں؟ ــــــ صرف گندم پیدا کر کے ہی اللہ میاں نے

اپنا ہاتھ کیوں نہ روک لیا ــــــ میری سنو اور اس زندگی کو
جو کہ تمہیں دی گئی ہے اچھی طرح استعمال کرو ــــــ تم ایسے
گاہک ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سرمایہ جمع
کرتے رہوگے مگر اسے ناکافی سمجھوگے۔ میں ایسا خریدار ہوں جو
زندگی میں کئی عورتوں سے سودے کرے گا ــــــ تم ایسا عشق
کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی پر کوئی ادنیٰ درجے کا مصنف ایک
کتاب لکھے جسے رائن وت سہگل بیلے کاغذوں پر چھاپے اور ڈبی
بازار میں اسے ردی کے بھاؤ بیچے ــــــ میں اپنی کتابِ حیات کے
تمام اوراق دیمک بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں تاکہ اس کا کوئی
نشان باقی نہ رہے۔ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو۔ میں زندگی میں
محبت چاہتا ہوں" (تکلیف)

عصمت کو اگر الجھے ہوئے سوت کے ڈھیر میں سے ایسا سرا مل جاتا۔ کھینچنے پر جو کھنچتا ہی چلا آتا اور وہ اس کے سہارے دور افق سے اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاتی اور منٹو اگر اپنی کتابِ حیات کے آدھے اوراق بھی دیمک بن کر چاٹنے میں کامیاب ہو جاتا تو آج ادب کی لوح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے کبھی نہ ہوتے۔ وہ دور افق سے بھی اوپر ہوا میں تنی رہتی اور منٹو کے پیٹ میں اس کی کتاب حیات کے باقی اوراق بھس بھر کے اس کے ہمدرد اسے شیشے کی الماری میں بند کر دیتے۔

"چوٹیں" کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے:۔

عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے

لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے"

عصمت کے متعلق جو کچھ میں لکھ رہا ہوں۔ کسی بھی قسم کی خفت مٹانے کا نتیجہ نہیں۔ ایک قرض تھا۔ جو سود کی بہت ہی ہلکی شرح کے ساتھ ادا کر رہا ہوں

سب سے پہلے میں نے عصمت کا کون سا افسانہ پڑھا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔ یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے حافظے کو بہت کھرچا۔ لیکن اس نے میری رہبری نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عصمت کے افسانے کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ لیکن جب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت ناامیدی ہوئی۔

چیمبرز کلیر روڈ بمبئی کے ۱۷ نمبر فلیٹ میں جہاں "مصور" ہفتہ وار کا دفتر تھا۔ شاہد لطیف اپنی بیوی کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ تمام کانگرسی لیڈر بہاتما گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی۔ فضا سیاسیات میں بسی ہوئی تھی اس لئے کچھ دیر گفتگو کا موضوع تحریک آزادی رہا۔ اس کے بعد رخ بدلا اور افسانوں کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک مہینہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا۔ ادب لطیف میں عصمت کا "لحاف" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے۔ میں نے کرشن چندر سے کہا تھا۔" افسانہ بہت اچھا ہے۔ لیکن آخری جملہ بہت ہی غیر صناعانہ ہے۔ احمد ندیم کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا" چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت سے کہا" آپ کا افسانہ لحاف مجھے بہت پسند آیا۔ بیان

میں الفاظ کو بقدرِ کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار یہ جملہ لکھ دیا کہ ایک انچ اٹھتے ہوئے لحاف میں میں نے کیا دیکھا۔ کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو میں کبھی نہیں بتاؤں گی۔"

عصمت نے کہا "کیا عیب ہے اس جملے میں؟"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شئے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے سخت ناامیدی ہوئی اس لئے کہ میں "لحاف" کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی۔"

مجھے یاد ہے کہ اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بیوی کو دہلی خط لکھا تھا۔ عصمت سے ملا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے جیسی تم ہو۔ میرا منہ تو بالکل کرکرا ہوگیا۔ لیکن تم اسے یقیناً پسند کروگی۔ میں نے جب اس سے ایک انچ اٹھے ہوئے لحاف کا ذکر کیا تو نالائق اس کا تصور کرتے ہی جھینپ گئی۔

ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے اس پہلے ردِ عمل پر سنجیدگی سے غور کیا اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اپنے فن کی بقا کے لئے انسان کو اپنی فطرت کی حدود میں رہنا ازبس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے؟ کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علحدہ ہوگیا اور کچھ پتلون کی جیبوں میں ٹھس ہو کر

رہ گیا فرانس میں جارج ساں نے نسوانیت کا حسین ملبوس اتار کر تصنع کی زندگی بتائی۔ پولستانی موسیقار شوپیں سے لہو تھکوا تھکوا کر اس نے لعل و گوہر ضرور پیدا کرائے لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بطن میں دم گھٹ کے مر گیا۔

میں نے سوچا عورت چاہے جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑے، پہاڑ کاٹے۔ افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہیے۔ اس کی باہوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہیے مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی!"

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تل، لحاف اور گیندا جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف۔ شفاف۔ ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ یہ ادائیں۔ وہ عشوے، وہ غمزے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کئے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزل مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی۔ انجانی۔ ان بوجھی مگر مخلص فطرت سے بغل گیر ہو جاتے ہیں

ان کی رنگت بدلی "بچارا بچہ ـــــ مر گیا اس کا باپ شاید"

"خاک تمہارے منہ میں۔ خدا نہ کرے" میں نے ننھے کو کلیجے سے لگا لیا۔

"ٹھائیں" ننھے نے موقعہ پا کر بندوق چلائی۔

"ہائیں باجی ـــــ ابا کو مارنا ہے" میں نے بندوق چھین لی۔

(بھول بھلیاں)

اور لوگ کہتے ہیں عصمت ناشدنی ہے، چڑیل ہے ـــــ گدھے کہیں کے

ان چار سطروں میں عصمت نے عورت کی روح نچوڑ کر رکھ دی ہے اور یہ لوگ اسے اخلاق کی امتحانی نلیوں میں بیٹھے ہلا ہلا کر دیکھ رہے ہیں۔ توپ دم کر دینا چاہیے ایسی اوندھی کھوپڑیوں کو۔

"ساقی" میں "دوزخی" چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا "سعادت! یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے موئے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے ...... کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں"

میں نے کہا "اقبال، اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج مرنے کے لئے تیار ہوں"

شاہ جہاں نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی" لکھا۔ شاہ جہاں نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے انھیں ترشوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نعش رکھدی ——— تاج شاہ جہاں کی محبت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن "دوزخی" عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے۔ عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا۔

میری بیوی نے یہ مضمون پڑھا تو عصمت سے کہا "یہ تم نے کیا خرافات لکھی ہے؟"

"بکو نہیں ——— لاؤ وہ برف کہاں ہے؟"

عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے، بالکل بچوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لئے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا

کر لکھتے ہیں چارپائی پر کہنیوں کے بل پر اوندھی لیٹی ہے۔ سامنے تکیے پر کاپی کھلی ہے ایک ہاتھ میں فاونٹن پن ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی۔ ریڈیو اونچے سروں میں چلّا رہا ہے۔ مگر اس کا قلم اور منہ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔

عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گذر جاتے ہیں پر جب دورے پڑے تو سیکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے ہیں کھانے پینے۔ نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑھے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔

"ٹیڑھی لکیر" جیسا طول طویل ناول میرا خیال ہے۔ عصمت نے سات آٹھ نشستوں میں ختم کیا تھا۔

کرشن چندر عصمت کے بیان کی رفتار کے متعلق لکھتا ہے:۔

افسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھوڑ دوڑ۔ یعنی رفتار، حرکت۔ سبک خرامی (میرا خیال ہے اس سے کرشن چندر کی مراد برق رفتاری تھی) اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔

عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع

کرے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔ باتیں کرے گی تو لفظ ایک دوسرے پر چڑھتے جائیں گے۔ سِٹینی بگھارنے کی خاطر اگر کبھی باورچی خانے میں چلی جائے گی تو معاملہ بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت ہی عجلت ہے اس لئے آٹے کا پیڑا بناتے ہی سنکائی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آلو ابھی چھیلے نہیں گئے، لیکن ان کا سالن اُس کے دماغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے بعض اوقات وہ باورچی خانے میں قدم رکھ کر خیال خیال میں شکم سیر ہوکر لوٹ آتی ہو گی لیکن اس حد سے بڑھی ہوئی عجلت کے مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بچّی کے فراک سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم لکھتے وقت املا کی غلطیاں کر جاتا ہے۔ لیکن ننھی کے فراک سیتے وقت اس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوتی۔ نپے تلے ٹانکے ہوتے ہیں اور محال ہے جو کہیں جھول ہو۔

"اُف رے بچے" میں عصمت لکھتی ہے :۔

"گھر کیا ہے محلّے کا محلّہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے دنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے ــــ سنتے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں۔ مرتے ہوں گے۔ کیا خبر؟"

اور پچھلے دنوں بمبئی میں۔ جب اس کی بچی سیما کو کالی کھانسی ہوئی تو وہ راتیں جاگتی تھی، ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ ممتا، ماں بننے کے ساتھ ہی کوکھ سے باہر نکلتی ہے۔

عصمت پرلے درجے کی ہٹ دھرم ہے۔ طبیعت میں ضد ہے بالکل بچوں کی سی، زندگی کے کسی نظریے کو فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی قبول نہیں کرے گی۔

عصمت کے زنانہ اور مردانہ کرداروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بری طرح مبتلا ہیں۔ لیکن نفرت کا اظہار کئے چلے جا رہے ہیں۔ جی گال چومنے کو چاہتا ہے۔ لیکن اس میں سوئی کھبو دیں گے۔ ہونے سے ٹھیکا نا ہوگا تو ایسی دھول جمائیں گے کہ دوسرا بلبلا اٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت۔ جو محض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے، عام طور پر عصمت کے افسانوں میں ایک نہایت ہی رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

عصمت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا اور میں اسے دیکھنے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

عصمت سے ملتے جلتے مجھے پانچ چھ برس ہو گئے ہیں۔ دونوں کی آتش گیر اور بھک سے اڑ جانے والی طبیعت کے پیش نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سیکڑوں لڑائیاں ہوتیں مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک بار چخ ہوئی اور وہ بھی ہلکی سی۔

شاہد اور عصمت کے مدعو کرنے پر میں اور میری بیوی صفیہ دونو ملاڈ (بمبئی کے مضافات میں ایک جگہ جہاں شاہد بمبئی ٹاکیز کی ملازمت کے دوران میں مقیم تھا) گئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا "منٹو تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں"

ڈیڑھ بجے تک میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ شاہد تھک گیا۔ دو بجے تک عصمت نے اپنے شوہر کی پیروی کی میں پھر بھی نہ مانا۔ دفعتاً کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا۔ میں نے جھٹ سے کہا "صحیح لفظ دراز دستی ہے" —— تین بج گئے، عصمت نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی۔ شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا۔ "د" کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہیں تھا۔ البتہ دراز دستی اور اس کے معنی درج تھے۔ شاہد نے کہا "عصمت اب تمھیں ماننا ہی پڑے گا" —— اب میاں بیوی میں چخ شروع ہوگئی مرغ اذانیں دینے لگا۔ عصمت نے لغت اٹھاکر ایک طرف پھینکی اور کہا "جب میں لغت بناؤں گی تو اس میں صحیح لفظ دست درازی ہوگا۔ یہ کیا ہوا دراز دستی —— دراز دستی"

کج بحثی کا یہ سلسلۂ دراز بہر حال ختم ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑے بلکہ یوں کہئے کہ ہم نے اس کا کبھی موقعہ ہی نہیں آنے دیا۔ گفتگو کرتے کرتے جب بھی کوئی خطرناک موڑ آیا یا تو عصمت نے رخ بدل لیا یا میں راستہ کاٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں، وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ لیکن اگر کوئی دفعتاً پوچھ بیٹھے۔ "تم دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو" تو میرا خیال ہے کہ میں اور عصمت دونوں کچھ عرصے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو جائیں۔

عصمت کی شکل و صورت دلفریب نہیں لیکن دل نشین ضرور ہے اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنی کی سفید دھوتی۔ سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چست بلاؤز۔ ہاتھ میں چھوٹا پرس۔ پاؤں میں بغیر ایڑھی کا براؤن چپل۔ چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور متجسس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک۔ چھوٹے مگر گھنگھریالے بال ــــ ٹیڑھی مانگ۔ ذرا سا مسکرانے پر بھی گالوں میں گڑھے پڑ پڑ جاتے تھے۔

میں عصمت پر عاشق نہ ہوا لیکن میری بیوی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ عصمت سے اگر صفیہ اس کا ذکر کرے تو وہ ضرور کچھ یوں کہے گی۔ بڑی آئی ہو میری محبت میں گرفتار ہونے والی ــــ تمہاری عمر کی لڑکیوں کے باپ تک قید ہوتے رہے ہیں۔ میری محبت میں۔"

ایک بزرگوار اہل قلم کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ جو بہت دیر تک عصمت کے پریم پجاری رہے۔ خط و کتابت کے ذریعے سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا۔ عصمت شہ دیتی رہی۔ لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ ثریا ہی دکھا دی غریب کو۔ یہ بھی کہانی میرا خیال ہے وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہو جانے کے خوف سے میرے اور عصمت کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوتی تھیں۔ میرا افسانہ کبھی شائع ہو تو پڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی۔ "نیلم" کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش و خروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا: "واقعی یہ بہن بنانا کیا ہے ـــــ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کسی عورت کو بہن کہنا۔ اس کی توہین ہے۔"

اور میں سوچتا رہ گیا ـــــ وہ مجھے منٹو بھائی کہتی ہے اور میں اسے عصمت بہن کہتا ہوں ـــــ دونوں کو خدا سمجھے!

ہماری پانچ چھ برس کی دوستی کے زمانے کا ایسا کوئی واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونو گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا تھا لیکن عصمت کا پہلا موقعہ تھا۔ اس لئے بہت بھنائی۔ اتفاق سے گرفتاری غیر قانونی نکلی۔ کیونکہ پنجاب پولس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بمبئی سے لاہور تک کافی لمبا سفر ہے لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور چڑانے کی خاطر ہم دونو کی فحش نگاری پر حملے کرتے رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر میں جھلا کر کہا۔ "سولی پر بھی چڑھا دیں لیکن یہاں حلق سے انا الحق ہی نکلے گا!"

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ

کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹولیاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا "منٹو بھائی، چوہدری نذیر سے کہیئے کہ وہ ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہی نکل آئے گا"

ہم دو دفعہ لاہور گئے اور دو ہی دفعہ ہم دونوں نے کرنال شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جوڑے سینڈلوں اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا" لاہور آپ کیا مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟"۔ عصمت نے جواب دیا" جی نہیں، جوتے خریدنے گئے تھے۔"

غالباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات ہے۔ ہولی کا تہوار تھا۔ ملاڈ میں شاہد اور میں بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے۔ عصمت میری بیوی کو اکسا رہی تھی "صفیہ، یہ لوگ اتنا روپیہ اڑائیں، ہم کیوں نہ اس عیش میں شریک ہوں"۔۔۔۔ دونوں ایک گھنٹے تک دل کڑا کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک دم ہلڑ سا مچا اور نلستان سے پروڈیوسر مکرجی، ان کی بھاری بھرکم بیوی اور دوسرے لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ چند منٹوں ہی میں ہم سب کا حلیہ ناقابل شناخت تھا۔ عصمت کی توجہ وسکی سے ہٹی اور رنگ پر مرکوز ہو گئی۔" آؤ صفیہ ہم بھی ان کے رنگ لگائیں۔"

ہم سب بازار میں نکل آئے۔ چنانچہ گھوڑ بندر روڈ پر باقاعدہ ہولی شروع ہو گئی۔ نیلے۔ پیلے سبز اور کالے رنگوں کا چھڑکاؤ سا شروع ہو گیا۔ عصمت پیش پیش تھی۔ ایک موٹی بنگالن کے چہرے پر تو اس نے تارکول کا لیپ کر دیا

اس وقت مجھے اس کے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خیال آیا۔ ایک دم عصمت نے جرنیلوں کے سے انداز میں کہا" آؤ، پری چہرہ کے گھر پہ دھاوا بولیں"

اُن دنوں نسیم بانو ہمارے فلم "چل چل رے نوجوان" میں کام کر رہی تھی۔ اس کا بنگلہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ پر تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی۔ چنانچہ چند منٹوں ہی میں ہم سب بنگلے کے اندر تھے۔ نسیم حسب عادت پورے میک اپ میں تھی اور نہایت ہی نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ وہ اور اس کا خاوند احسان ہمارا شور سن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جو رنگوں میں لتھڑی ہوئی۔ بھتنی سی لگتی تھی۔ میری بیوی سے جس پہ مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا، نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا" صفیہ نسیم واقعی حسین عورت ہے۔"

میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا "حُسن ہے لیکن بہت ہی ٹھنڈا۔"

عینک کے رنگ آلود شیشوں کے پیچھے عصمت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھومیں اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "صفراوی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور ایک سکنڈ کے بعد پری چہرہ نسیم سرکس کا مسخرہ بنی تھی۔

عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں "منٹو بھائی، جی چاہتا ہے، اب مرغ اور مرغیوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں" یا "میں تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی اور ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی۔"

چند مہینوں کی بات ہے۔ میں اور عصمت بمبئی ٹاکیز سے واپس الیکٹرک ٹرین میں گھر جا رہے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا: "کرشن چندر کے افسانوں میں دو چیزیں میں نے عام دیکھی ہیں ــــ زنا بالجبر اور قوسِ قزح جسے وہ قوس و قزح لکھتا ہے۔" عصمت نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "یہ تو ہے"

"سوچتا ہوں ایک مضمون لکھوں۔ جس کا عنوان "کرشن چندر، قوسِ قزح اور زنا بالجبر ہو" ... ... میں ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا۔" لیکن زنا بالجبر سے قوسِ قزح کا نفسیاتی رشتہ کیا ہو سکتا ہے؟"

عصمت نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا "جمالیاتی نقطۂ نظر سے قوسِ قزح کے رنگوں میں انتہائی جاذبیت اور کشش ... ... لیکن آپ تو کسی اور زاوئے سے سوچ رہے تھے"

"جی ہاں ... ... سُرخ رنگ آگ اور خون کا رنگ ہے۔ ضمیات میں اس رنگ کو مریخ یعنی جلاد فلک سے منسوب کیا جاتا ہے ... ... ہو سکتا ہے کہ زنا بالجبر سے قوسِ قزح کے صرف اسی رنگ کا دامن بندھا ہو ... ..."

"ہو سکتا ہے ــــ آپ یہ مضمون ضرور لکھئے"

"لیکن عیسائیوں کے فنِ مصوری میں سُرخ رنگ عشقِ الٰہی کا مظہر ہے ... ... نہیں نہیں" میرے دماغ میں دفعتاً ایک خلیہ جھوٹا صلیب پر چڑھنے کے شدید جذبے کو بھی اسی رنگ سے معنون کیا گیا ہے۔ اور کنواری مریم کا لباس سُرخ ہوتا ہے یہ عصمت کی نشانی ہے ... ..."

یہ کہتے کہتے میں نے اچانک عصمت کے سفید لباس کی طرف دیکھا

وہ مسکرا دی۔ "منٹو بھائی آپ یہ مضمون ضرور لکھئے، مزا آجائے گا — لیکن عنوان میں سے بالجبر اڑا دیجئے۔"

"کرشن کو اعتراض ہوگا۔ کیونکہ وہ جبریہ فعل سمجھ کر ہی تو روتا ہے۔"

"بیکار روتا ہے ... ... کیا معلوم کہ یہ ظلم ہی اس کی مظلوم ہیروئن کو اچھا لگا ہو۔"

اللہ بہتر جانتا ہے!

عصمت کی افسانہ نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں۔ حق میں کم خلاف میں زیادہ۔ کچھ تو بالکل مجذوب کی بڑ ہیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔

پطرس صاحب نے بھی جن کو لاہور کے ادبی ٹھیکہ داروں نے ڈبیا میں بند کر رکھا تھا اپنا ہاتھ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ دیا۔ آدمی ذہین ہیں، طبیعت میں شوخی اور مزاح ہے اس لئے مضمون، کافی دلچسپ اور سلجھا ہوا ہے۔ آپ عورت کے پیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ایک اور منقدر دیختہ کار دیباچہ نویس (آپ کی مراد صلاح الدین صاحب سے ہے)، نے بھی معلوم ہوتا ہے انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں۔ عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے ان کو ہم کم و بیش انھیں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا،

"گویا ادب کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیٰحدہ ہوتے ہیں۔

"جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلّم۔ لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تنک ہی ملا اور پوچھوں تو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیٰحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی ما بہ الامتیاز ایسا ہے۔ جو خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جبلّی اور بنیادی، جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ ہو بہرحال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنیاد پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔"

ان سوالوں کا جواب بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن جواب دیتے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے ـــــ مرد یا عورت؟ کیونکہ صنف معلوم ہونے پر سوال کرنے والے کا جبلّی اور بنیادی زاویۂ نگاہ بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔

پطرس صاحب کا یہ کہنا کہ "گویا ادب بھی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیٰحدہ ہوتے ہیں"۔ ٹھیٹ پطرس نقرے بازی ہے۔ ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں۔ لیکن عورتوں اور مردوں

کے بیچ علیحدہ ہونا بے ادبی بھی نہیں۔

پطرس صاحب کلاس میں لکچر دیتے ہیں تو طلبہ اور طالبات سے ان کا خطاب جداگانہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب انھیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کے دماغی نشو و نما پر غور کرنا پڑے گا تو ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ ان کی جنس سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔

عورت اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور نہ کیا جائے ہیجڑے کے ادب کے متعلق بھی کیا پطرس صاحب ہی استفسار فرمائیں گے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے۔ داخلی اور جبلی اور بنیادی جو انشا پرداز ہیجڑوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں اور عورتوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے۔

میں عورت پر عورت اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا بھونڈے پن کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مسجدوں اور مندروں پر یہ بورڈ لگانا کہ یہ عبادت اور بندگی کی جگہیں ہیں بہت ہی مضحکہ خیز ہے۔ لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں کسی عام رہائش گاہ کو رکھ کر ہم فن تعمیر کا جائزہ لیں گے۔ تو اس پر مندر اور مسجد کی تقدیس کا اثر اپنے ذہن سے محو نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر نقطے میں موجود ہے۔ جو اس کو سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانبداری سے بیان کیا ہے، ہم مصنف کی جنس سے علحدہ نہیں کر سکتے۔

اور نہ ایسا کرنے کے لئے کوئی تنقیدی، ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔
کوئی عزیز احمد صاحب ہیں: "نیا دور" میں عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جسم کے اختساب کا عصمت کے پاس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے مساس۔ چنانچہ رشید سے لیکر ٹیلر تک بیسوں مرد جو اس ناول میں آتے ہیں۔ سب کا اندازہ جسمی یا ذہنی مساس سے کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مساس کی کیفیت انفعالی ہی ہوتی ہے مساس ہی عصمت کے یہاں اختساب مرد، اختساب انسان اختساب زندگی، اختساب کائنات کا واحد ذریعہ ہے۔ رعنائیوں کے باددوں میں عباس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل کر بکھر جاتی ہیں۔ رسول فاطمہ کے چوہے جیسے ہاتھ مساس کا تاریک رخ ہیں۔ نیم تاریک رخ میٹرن اور کا وہ منافرہ یا معاشقہ ہے جس میں میٹرن کو تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی ہوئی محسوس نہیں کرتیں۔ مساس کے سلسلے میں شمن کا نسوانی احساس (پطرس صاحب متوجہ ہوں) ران پر انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا ہے۔ الخ"

عزیز احمد صاحب کا یہ نظریہ غلط ہے کہ عصمت کے یہاں اختساب کا ذریعہ

ایک فقط مساس ہی ہے۔ اوّل تو مساس کہنا ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسا عمل یا فعل ہے جو کچھ دیر جاری رہتا ہے۔ عصمت تو غایت درجہ ذکی الحس ہے۔ ہلکا سا لمس ہی اس کے لئے کافی ہے۔ عصمت کے یہاں آپ کو دوسری جسمانی حِسّیں بھی محو عمل نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر سونگھنے اور سننے کی حِس۔ صوت کا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں عصمت کے ادب سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔

"گھر گھر۔ پھٹ شوں۔ فش۔ باہر برآمدے میں موٹر بھنّا رہی تھی۔"

"ریڈیو کو مروڑتے رہے۔ کھڑ کھڑ، شرڑ، شرڑ، گھر گھر"۔ میرے آنسو نکل آئے۔"

"ٹنن ٹنن۔ سائیکل کی گھنٹی بجی، میں سمجھ گئی، ایڈنا آگئی، (ٹیڑھی لکیر)

"اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھا دھم ٹھٹوں کی آواز چھت پر آئی۔"

"اور دھم دھم۔ چھن چھن کرتی ہو سیڑھیوں پر سے اتری۔"

"غُن غُن، غُن غُن" بہو منمنائی۔"

مکھی۔ "تنن تنن کر کے رہ گئی" (ساس)

"بچّہ کوں کوں کر کے چپڑ چپڑ منہ مارنے لگتا۔" (سفر میں)

"بلی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں" (لحاف)

"ٹک، ٹک۔ ٹک ٹک۔ گھڑی کی طرح اس کا دل ہلنے لگا۔"

"موٹے موٹے قہقہے لگاتے ہوئے مچھر" (تل)

"ایک پر اسرار قبرستانی سسکی ہوا میں لرزتی ہے" (چھری میں سو)

"گھنگھرو دؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں بھنوں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں" (پیشہ)

اسی طرح سونگھنے کی حس بھی جگہ جگہ مصروف عمل ہے

"اور بو تو دیکھو۔ حقے کی سڑاند ہے۔ توبہ، تھو۔"

"قوام کی بو ایسی بس گئی تھی کہ اسے نیند نہ آئی" (ڈائن)

"سرسوں کا تیل آٹھویں دن ہی کھٹی کھٹی بو دینے لگتا" (نیرا)

"اور جسم سے عجیب گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے تھے"

"گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انھیں انگارہ بنادیا"

"میں نے نتھنے پھلا کر "سوں سوں" ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ محسوس نہ ہوا" (لحاف)

"سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر دکھا دیا تھا" (تل)

"پسینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چراند آنے لگی تھی" (جال)

"مردانہ قمیص۔ سگرٹ کی بو میں غرق ملگجی سی" (ہیرو)

"نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی" (میرا بچہ)

عصمت کی سب حسیں وقت پڑنے پر اپنی اپنی جگہ کام کرتی ہیں اور ٹھیک طور سے کرتی ہیں۔ عزیز احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جنس ایک مرض کی طرح

عصمت کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ ممکن ہے ان کی تشخیص کے مطابق درست ہو۔ مگر وہ اس مرض کے لئے نسخے تجویز نہ فرمائیں۔ یوں تو لکھنا بھی ایک مرض ہے۔ کامل طور پر صحت مند آدمی جس کا درجہ حرارت ہمیشہ ساڑھے اٹھانوے ہی رہے۔ ساری عمر اپنی زندگی کی ٹھنڈی سلیٹ ہاتھ میں لئے بیٹھا رہے گا

عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں:۔

عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔ عشق ایک ایسی چیز ہے جس کا جسم سے وہی تعلق ہے جو بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دبا دو تو یہی عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی جھلستی لو میں پنکھا جھلتا ہے۔ ہزاروں دیووں کی طاقت سے زندگی کی عظیم الشان مشینوں کے پہیے گھماتا ہے اور کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے۔ ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیت مصنفہ واقف نہیں۔

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا افسوس ہے۔ مگر یہ عشق جس سے عزیز احمد صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے پنج سالہ اسکیموں کے ماتحت تیار کیا ہے اور اب وہ اسے ہر انسان پر عائد کر دینا چاہتے ہیں ... ... عزیز احمد صاحب کو خوش کرنے کے

لئے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی ہیروئن اس عشق کے اے سی اور ڈی سی دونو کرنٹوں سے واقف تھی۔ ... ... لیکن پھر یہ ٹریجڈی کیسے وقوع پذیر ہوتی کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد صاحب کے تصنیف کردہ عشق سے ناآشنا ہے اور اس کی یہ ناآشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے۔ اگر آج اس کی زندگی کے تاروں کے ساتھ اس عشق کی بجلی جوڑ دی جائے اور کھٹکا دبا دیا جائے تو بہت ممکن ہے ایک اور عزیز احمد پیدا ہو جائے۔ لیکن "تل، گیندا" بھول بھلیاں اور جال تصنیف کرنے والی عصمت یقیناً مر جائے گی۔

عصمت کے ڈرامے کمزور ہیں۔ جگہ جگہ ان میں جھول ہے۔ عصمت پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہے تو ناپ کر قینچی سے نہیں کترتی۔ یوں ہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر چیتھڑے بنا ڈالتی ہے۔ پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں اس میں وہ بالکل اجنبی رہتی ہے۔ جنس عصمت کے اعصاب پر ایک مرض کی طرح سوار ہے۔ عصمت کا بچپن بڑا غیر صحت بخش رہا ہے۔ پردے کے اس پار کی تفصیلات بیان کرنے میں عصمت کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔ شخصیتوں سے نہیں اشخاص سے ہے عصمت کے پاس جسم کے احتساب کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے مساس۔ عصمت کے افسانوں کی کوئی سمت ہی نہیں۔ عصمت کی غیر معمولی قوت مشاہدہ حیرت میں غرق کر دیتی ہے۔ عصمت فحش نگار ہے ... ... ہلکا ہلکا

طنز اور مزاح عصمت کے اسٹائل کی ممتاز خوبیاں ہیں ... ... عصمت تلوار کی دھار پر چلتی ہے۔

عصمت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کوئی اسے پسند کرے گا کوئی ناپسند۔ لیکن لوگوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے زیادہ اہم چیز عصمت کی تخلیقی قوت ہے۔ بری، بھلی، عریاں، مستور، جیسی بھی ہے قائم رہنی چاہیے۔ ادب کا کوئی جغرافیہ نہیں۔ اسے نقشوں اور خاکوں کی قید سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہیے۔

عرصہ ہوا دہلی کے ایک ذات شریف دیش نے عجیب و غریب حرکت کی۔ آپ نے "اوروں کی کہانی سن میری زبانی" ۔ "اس کے پڑھنے سے بہنوں کا بھلا ہوگا۔" جیسے عنوان سے شائع کی۔ اس میں میرا، عصمت، مفتی، پریم چند، خواجہ محمد شفیع اور عظیم بیگ چغتائی کا ایک ایک افسانہ شامل تھا۔ دیباچے میں ترقی پسند ادب پر ایک تنقیدی چوٹ مارُوں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق فرمائی گئی تھی۔ اور اس کارنامے کو اپنے دو ننھے ننھے بچوں کے نام سے معنون کیا گیا تھا۔ اس کی ایک کاپی آپ نے عصمت کو اور مجھے روانہ کی۔ عصمت کو دیش کی یہ ناشائستہ اور بھونڈی حرکت سخت ناپسند آئی، چنانچہ بہت ہی بھنا کر مجھے ایک خط لکھا :-

منٹو بھائی آپ نے وہ کتاب جو دیش نے چھاپی ہے دیکھی؟ ۔ ذرا اسے پھٹکاریے اور ایک نوٹس دیجیے نجی طور پر کہ ہر مضمون کا جرمانہ دو سو روپئے دو ورنہ

دعویٰ ٹھونک دیں گے۔ کچھ ہونا چاہیئے۔ آپ بتائیے کیا
کیا جائے۔ یہ خوب ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے اٹھا کر
ہمیں کیچڑ میں لتھیڑ دیتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہتے۔ ذرا مزہ
رہے گا۔ اس شخص کو خوب رگڑئیے۔ ڈانٹئے کہ اشاعلم بردار
کیوں بن رہا ہے عریاں ادب کا۔ اس نے ہمارے افسانے
صرف کتاب فروخت کرنے کے لیے چھاپے ہیں۔ ہماری
ہتک ہے کہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے، کم عقلوں کی ڈانٹیں
سننا پڑیں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو سامنے رکھ کر
ایک مضمون لکھئے۔ آپ کہیں گے میں کیوں نہیں لکھتی تو
جواب ہے کہ آپ پہلے ہیں۔

جب عصمت سے ملاقات ہوئی تو اس خط کا جواب دیتے ہوئے
میں نے کہا "سب سے پہلے لاہور کے چوہدری محمد حسین صاحب ہیں۔ ان سے
ہم درخواست کریں تو وہ ضرور مسٹر ڈیتش پر مقدمہ چلوا دیں گے"

عصمت مسکرائی "تجویز تو ٹھیک ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم
بھی ساتھ دھر لیے جائیں گے"

میں نے کہا "کیا ہوا ——— عدالت خشک جگہ سہی لیکن کرنال
شاپ تو کافی دلچسپ جگہ ہے ——— مسٹر ڈیتش کو وہاں لے جائیں گے"
اور ... ... عصمت کے گالوں کے گڑھے گہرے ہو گئے۔

انتخاب

دوزخی

گیندا

دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گرویدہ بنایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ ”گھر کی مرغی دال برابر“ والا مضمون گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا۔ یہ ادب نہیں پھکڑ، مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہوں گی۔ یعنی سب بے پڑھے رائے قائم۔ مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی

کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔ شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خود ستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون "بکہ" نظر آیا میں اور عظیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آگئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل۔ مگر ہم جیسے چڑھ گئے اور منہ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار تھے۔ بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں"، اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہوگئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر ان کی ہی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے۔

"تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں" اور انھوں نے چھیڑا۔ ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے جھنجھلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا۔ اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہوگئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی، حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے۔ مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں اور بخدا جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز کیسی

کڑوی مسکراہٹ اور کٹیلے ہوئے جملے ۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو" اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے ۔ اس لئے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہوگئیں ۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا ۔ اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگاکر پڑھیں ۔ دل لگاکر پڑھنے کی بھی خوب رہی ۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی ۔ دل خود بخود کھنچنے لگا ۔ اُفوہ ! تو یہ کچھ لکھا ہے ۔ ان رسیلے والی کتابوں میں ۔ ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ۔ اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال ۔ وہ پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی ، پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت ٹوٹے ہوئے ناہموار دانت اور وہ لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آگیا تھا ۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں جن کے سرے پر ورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ اُن کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے چہرے جیسے سینے پر دھونکنی کا سا شبہ ہوتا تھا ۔ تکیوں پر ہزاروں کپڑوں ، بنیانوں کی تہیں اور

اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چیلاؤں! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا قہار و جبار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمے کے عذاب نازل کر رہا ہے۔ اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کونسا دنیا اور دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا۔ مگر پھر بھی رلا نہ سکا۔ اس دکھ میں جلن میں ہنستے ہی نہیں ہنساتے رہنا کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے " زندہ لاش" خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جاندار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل! اس میں کتنی جان تھی! منہ پر گوشت نام کو نہ تھا۔ مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آجانے سے چہرہ خوبصورت ہو گیا تھا۔ کنپٹیاں بھر گئی تھیں۔ پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے ایک موت کی سی جلا چہرے پر آ گئی تھی۔ اور رنگت میں کچھ عجب طلسمی سبزی سی آ گئی تھی جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی۔ اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بیکس ہاتھ لرزنے لگتے سینہ پھٹنے پر آ جاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص، پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ "خانم" پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں ان میں اتنی جان ہی کب تھی۔ مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے۔ ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار، نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لئے خانم کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیرکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھائی جان، نانی اماں، شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھتیجی، بھتیجی، یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا۔ اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم میاں لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لئے ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم چلتے پھرتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے۔ خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں۔ اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہیں۔

"کمر یا بہادر" جس کا پہلا ٹکڑا "روح لطافت" میں چھپا ہے، یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہاں کی شرارتیں کروا لیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمزاد چوریاں کرتا، شرارتیں کرتا ہے

خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا۔ دوسرے بھائیوں کی طرح۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیئے نا جینے کے لئے۔

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی۔ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا، مگر بے بس، سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی۔ نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انھیں بھی انسان سمجھے، انھیں بھی کوئی ڈانٹے۔ انھیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے لہذا ایک ترکیب نکالی۔ اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی ماں، باپ، سب کو نفرت ہوگئی۔ اچھا خاصا گھر میدان جنگ بن گیا اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے، اور کمزور، لاچار ہر دم کا روگی، تعمیر کا ویلن ہیرو بن گیا اور کیا چاہیئے ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں

زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے، بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انھیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا۔ اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھکر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی۔ بچے باپ نہ سمجھتے۔ بہن نے کہدیا تم میرے بھائی نہیں، اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی "سانپ جنا تھا میں نے!"

مرنے سے پہلے قابل رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں جی چاہتا تھا جلدی سے مر جکیں۔ آنکھوں میں دم ہے۔ مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے عذاب دوزخ بن گئے ہیں۔ ہزاروں کہانیوں، افسانوں کا ہیرو ایک ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب بھی کوئی اسے پیار کرے، بیوی پوجا کرے۔ بچے محبت سے دیکھیں۔ بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے واقعی پھر کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے۔ ورم بڑھ گیا۔ آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی، انسان کس قدر پر ہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔

صبح چار بجے آج سے ۴۲ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا۔ وہ زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۲۰۔ اگست کو صبح چھ بجے شمیم نے آکر کہا "منے بھائی ختم ہو رہے

ہیں۔ اٹھو!"

وہ کبھی ختم نہ ہوں گے —— بیکار مجھے جگا رہے ہو ——" میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں ——" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا

"ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے —— ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے"، میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں، ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابی انھیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

"منے بھائی" میں نے ان پر جھک کر کہا۔ ایک لمحے کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں، ہونٹ سکڑے، اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی، ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں۔ جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منے بھائی" نہ جانے کس نے کہا۔

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے" مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں، ناممکن ہے وہ کبھی نہیں مر سکتے ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لئے تو وہ مر کر ہی جیے اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے اور

برابر پیدا ہوتے رہیں گے "۔ ان کا پیغام " دکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو، اور مرکر بھی لڑتے رہو "۔ یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے ان کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا۔ ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں۔ ماں باپ کو دکھ دیا۔ بیوی کو دکھ دیا۔ بچوں کو دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ ہیں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار تو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑھے تیل میں تلا۔ وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑھا چڑھا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں۔ جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہوں گے۔ ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی۔ ملاؤں کے فتووں سے اس کی گردن دب رہی ہو گی۔ آروں سے اس کا جسم چیرا جا رہا ہوگا۔ مگر وہ ہنس رہا ہوگا آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی۔ نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہوں گے مگر کوئی اسے سن نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی باہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی گوشے میں امرود برابر پھوڑا، آخری دم اور

چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہوگئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے۔ یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن پہونچیں" یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہے۔ پتھر کا کلیجہ ہو۔ مرتے وقت جملے کسنے کے لئے۔ ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد آئے۔ پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن! بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان تھی کہ قینچی! اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے۔ خیالات بدل گئے ہیں۔ ہم لوگ بد زبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری، سوشل ازم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے ہم جو کچھ لکھتے ہیں، دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے، نادار، بیمار اور مفلس تھے سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے دکھ میں ٹھٹھہ لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں ہنس کر دکھ کو نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو، اس سے دوستی کھرپا بہادر میں جو شاہ لنگران کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر جو کچھ انھوں نے

لکھا اسی بڑھیا میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن۔ بھشتن، راہ چلیتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے۔ وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی، آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے، ہزاروں قصے سنتے اور سناتے۔ وہی قصے "سوانہ کی روحیں"۔ "ہمارا لی کا خواب"۔ "چمکی" اور "بریکے" بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے۔ اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے ان کی کہانیوں میں۔ بہت سی باتیں بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی۔ خصوصاً "کوتار" تو بالکل ردی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں گڑ بڑ کر کے لکھ دیا ہے "شریر بیوی"، تو بالکل فضول ہے۔ مگر اپنے زمانے کی بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

"چمکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ اف وہ چمکی کی خاموش نگاہوں کے پیغام۔ وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا۔ اور پھر خود مصنف کی زندگی کس قدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا۔ جو ان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا تھا۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر

مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں گل بکاؤلی، زہرِ عشق وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انھیں پرانی کہہ دبا گیا تھا لیکن اب پھر یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ، پنڈلیوں کی گاودی رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے، گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے، وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے باتیں نہیں کرتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ "نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں۔ لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں" اماں کہا نا "معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے کہ ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری مصوری قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبولِ عام نہیں رہ سکتے، یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی "الف لیلہ" کا رنگ غالب آگیا۔

انھیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے "یہ عورت بہت پیارے جھوٹ بولتی ہے" انھیں شکایت تھی کہ میں بہت ہی اسٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں، اور ان کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں

اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً "جھوٹ" کہا کرتے تھے، جہاں انھوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے۔ پھر قصرِ صحرا" لکھنے لگے؟ وہ ان کی گپوں کو" قصرِ صحرا" کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے،" سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہا ہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔"

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ" جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو" قصرِ صحرا" ہے اس پر ماموں کہتے :

ارے اس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے"، اس پہ وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انھیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کہتے تھے" دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزے دار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزے دار ہے۔"

کہتے تھے،" میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر بنوا دیتا بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مرنے سے آمدنی ہوتی "

انھیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے" دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں۔ عقل چاہیے ان چیزوں کے لیے "

انھیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا۔ مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کا۔ عموماً پیسے دے کر ڈھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انھیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انھیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے۔ کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لئے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈھ کر حفظ کر لیتے تھے۔ اور سنا کر لڑا کرتے تھے ان حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مدّاح تھے اور امام حسین کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے "میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؓ کھڑے ہیں، ادھر سے یزید لعین آیا۔ آپ کے پیر پکڑ لئے گڑگڑایا ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا۔ اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا بس میں نے بھی اس دن سے یزید کی عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو ان کا ملاپ بھی ہو گیا۔ پھر ہم کیوں لڑیں "

سیاسیات سے کم دلچسپی تھی۔ کہتے تھے " بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔ بہت سال ہوئے کچھ مضامین ریاست میں سیاسیات اور کانگریس پر لکھے تھے۔ وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا۔ مگر آخر میں آ کر بحث کم کر دی تھی۔ کہتے تھے :-

"بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا۔ لہذا چپ ہی رہو۔ پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے۔ مگر آخر میں کہنے لگے "یہ پرانی بات ہوگئی۔ اب پردہ روکے سے نہیں رک سکتا۔ اس معاملہ میں ہم چکے اب تو نئی پریشانیاں ہیں۔" لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤ گے تو فرماتے "یہاں کونسی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا۔ کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں ——" کبھی کہتے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مرجائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ سب انھیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں۔ یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے الجھ رہے ہیں۔ یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ہے۔ ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ دوزخی کا کیا ٹھکانا؟

گیندا

"جنے یہ جھونپڑی ہے۔ ہے نا!" میں نے اور گیندا نے بالکبری کی گھنداد جھاڑی کے نیچے رینگتے ہوئے تصور کیا۔ اور ہم دونوں جھکے جھکے دونوں ہاتھوں سے زمین صاف کرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں پیلی پیلی مٹی کے صاف اور چکنے فرش پر ہم نہایت بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ذرا سوچ بچار کے بعد ہم اپنا مرغوب ترین کھیل "دلہن دلہن" کھیلنے لگے۔ گیندا نے اپنی بدبودار سُرخ اوڑھنی کا لمبا سا گھونگٹ مار لیا اور گری پڑی ہوکر بیٹھ گئی۔ میں نے آہستہ سے گھونگھٹ اٹھاکر "دلہن" کا منہ دیکھا۔ گیندا کا گول مٹول چہرہ خون کے ایک دم دوڑ جانے کی وجہ سے بیر بہوٹی کی طرح لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بے چینی سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اور وہ بمشکل اپنی ہنسی کو دبائے ہوئے تھی۔

"اب ہم ... ... گیندا ابھی اب ہم" میں نے رشک سے تڑپ کر کہا۔

"اہا" بھیا نے ٹہنیاں ہٹا کر ہمیں دیکھتے ہوئے کہا: "یہ کیا ہو رہا ہے؟"
گیندا نے ہڑبڑا کر گھونگھٹ پھینک دیا اور سہم کر بیٹھ گئی۔ ہمارے دل دھک دھک کرنے لگے۔

بھیا کیا کسی کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ہم "دلہن" کا کھیل کھیل رہے تھے تو یقیناً ہم پہ مار پڑتی۔ یہ پر شوق کھیل تو ہم ہمیشہ چھپ چھپ کر ہی کھیلا کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں؟

"آں.... ں" میں نے اٹھلا کر کہا: "ہم تو کھیل رہے ہیں۔"

بھیا شاید ہنسی کے دم میں تھے کہ جھکتے ہوئے خود بھی اندر آ گئے اور اکڑوں بیٹھ گئے مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ گھبرا گئے۔

"اوں ہوں۔ کمبخت یہاں کیسے بیٹھی ہو؟" انھوں نے ایک ٹہنی سے اپنی ناک بچا کر کہا۔

"اور گیندا" انھوں نے اس کے پھولے ہوئے گال میں چٹکی لے کر کہا "اور تو یہاں بیٹھی ہے۔ کہتا ہوں نکل سے!"

گیندا نے اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا

"ارے باپ رے" اور وہ اپنا مختصر سا لہنگا سنبھال کر بھاگنے لگی۔

"آں... گیندا تو مت جا" میں نے اسے پکڑ کر مچلتے ہوئے کہا

"دادا مارے گا پھر" اس نے بھیا سے ڈرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مارے گا۔ تو نے کام تو کر لیا؟"

"اچھا بیٹھ" بھیا نے نرمی سے گیندا کو اپنے پاس گھسیٹتے ہوئے کہا "مگر پاپن تجھے تو ضرور پٹواؤں گا۔ یہاں زمین پہ لوٹ لوٹ کر کپڑے گندے کر رہی ہے

"کہہ دینا، کہہ دینا۔ میں کوئی ڈرتی ہوں" میں نے ڈر کر کہا اور کپڑے جھاڑنے لگی
"گیندا ... ... ارے او گیندیا ... آ ... کدھر مرگئی" بھو کی آواز
گونجی۔ اور گیندا بھیا سے ہاتھ چھڑا کر تیر کی طرح بھاگی۔

اُن کی آن میں کھیل بگڑ گیا۔ میں بھیّا سے الجھ پڑی اور کرتی بھی کیا۔

"ایں ... ں ... جاؤ یہاں سے" میں نے منمنا کر کہا۔

"بھتنی" انھوں نے گھٹی ہوئی آواز میں دانت پیس کر کہا۔ اور ایک دھپ میرے لگا کر چل دئے۔

(۲)

"بدھوا کاہے کو سنگھار کرے" گیندا نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔

"بدھوا!" میں نے سرخ اینٹ کو جسے میں سیندور تیار کرنے کے لئے پتھر پر گھس رہی تھی۔ کرتے سے پونچھ کر کہا "بدھوا!"

"ہاں، اور کیا۔ ہم بدھوا ہیں" مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے گیندا نے فخریہ کہا

"اور ہم!" میں نے حرص کی۔

"تم" وہ حقارت سے منہ بنانے لگی۔ "تم تو کنیا ہو۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔" اس نے مذاق اڑایا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ گیندا مجھے ہمیشہ حقیر سمجھتی ہے۔ میں، مجال ہے، جو اس کی برابری کر جاؤں۔ پچھلے بیساکھ میں اس کا بیاہ ہوا۔ سرخ سرخ کپڑے پہنائے گئے۔ چمکتے ہوئے چاندی کے زیور بلا شرکت غیرے اس کی ملکیت ہوگئے اور وہ کئی دن تک چھم چھم کرتی اٹھلاتی پھری۔ میں بیچاری کسی شمار و قطار ہی میں

نہیں۔ ٹکر ٹکر منہ دیکھنا اور حرصیائی بلی کی طرح اس کے پیچھے لگے رہنا۔ کبھی اس کی چوڑیاں گنتی۔ کبھی اس کے گھنگر و سنبھالتی۔ کبھی اس کا چھوٹے گوٹے کا دوپٹہ زمین سے لگ جانے پر تڑپ کر اٹھا لیتی۔ اماں کی زیادتی دیکھو اگر میں ذرا لحاف کا ہی گھونگھٹ نکال کر بیٹھوں تو ڈانٹ بتاتی ہیں، اونھ، آخر کیوں؟

"کیوں بچھونے کھوند رہی ہے؟ جیسے لحاف گھونگھٹ کے استعمال سے پھٹ ہی تو جائے گا۔"

جو کبھی دوپٹیا اوڑھنے کو مانگوں تو جھڑک دیتی ہیں۔

"نہیں۔ کیچڑ میں لتھڑنے کو نا!"

یہ مانا کہ میں گیندا سے چھوٹی ہوں مگر اتنی ننھی بھی نہیں کہ دلہن نہ بن سکوں۔ مجھ سے کہو، ساری عمر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی رہوں۔ اور ذرا بھی جی نہ گھبرائے آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ گیندا کا میاں برسات میں مر گیا۔ سارا گھر دن رات رونا پیٹنا رہا۔ گیندا کی تو چوڑیاں توڑ دی گئیں۔ اور وہ بھی خوب رو لی۔ "ہا بچاری گیندا!" سب اس کو سمجھاتے بجھاتے اور پیار کرتے، اور میرا تو گھر میں کوئی نوٹس بھی نہ لیتا ہر بات میں یہی کہ بس ابھی بچہ ہوں، ابھی چھوٹی ہوں۔ خاک پڑے اس چھوٹے پن کو آخر کب تک چھوٹی رہوں گی؟ اتنی تو بڑی ہو گئی کہ نیلی شلوار بھی اونچی ہو گئی اور گلابی قمیص بھی اب زہرہ کو دے دی گئی۔ ایک ذرا سجنے کی قمیص تھی وہ بھی چھوٹی ہو گئی۔ اچھی اچھی چیزوں کے لئے تو میں "ڈھونگری" ہو جاتی ہوں، اور ویسے مطلب کے وقت مجھے سب چھوٹا بنا دیتے ہیں۔ یہ اب تک مجھے نہیں معلوم کہ چھوٹی ہوں کہ بڑی۔ کچھ عجب الجھن ہے۔ اونہہ!

"تم تو سنگھار نہیں کرتیں ؟" میں نے بیکار دہرایا۔

"جب پتی ہی مرجائے تو پھر کس پہ سنگھار کریں۔ گیندا نے صوفیانہ لہجہ اختیار کر لیا۔ مانگ کا سیندور، ہاتھ کی چوڑی پتی ہی کے لئے ہوتی ہے نا؟ اس نے سنی سنائی بات کا یقین کا رنگ دینے کی کوشش کی۔

"دیکھ گیندا کتنا ڈھیر سا سیندور بن گیا"۔ میں نے پسی ہوئی اینٹ کو انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے کہا۔

گیندا سیندور کی چھوٹی سی ڈھیری کو ایک کمسن بیوہ کی طرح دیکھنے لگی لیکن جلد ہی ہم دونوں مسکرانے لگے۔

"تو بھابی سے نہ کہنا ... اچھا ... آؤ" اس نے آگے سرک کر کہا اور ہم دونوں سنگھار کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے ایک تجربہ کار مشاطہ کی طرح گیندا کے الجھے ہوئے بالوں کو بمشکل پانی سے چپکایا اور اس میں سیندور بھر دیا۔ گیندا کا چہرہ لال لال ہو گیا اور اس نے شرما کر منہ اوڑھنی میں چھپا لیا اور ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

"ارے ارے" میں نے اسے تنبیہ کی۔ "سب بگڑ جائے گا بھئی ہم نہیں"

"لاؤ اب تمہارے لگاؤں" گیندا نے میرے سر پہ پانی چپڑ کر کہا۔

"اور بندی ؟" میں نے آنکھوں کو جھپکا کر کہا۔

"ہاں ... ہاں ... اور کیا" اس نے اطمینان دلایا۔

ایک ذرا سی دیر میں ہم دونوں سیندور سے مانگ بھر اور بندیاں لگا سر پہ اوڑھنیاں منڈھ کر سلیقے سے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کا منہ

دیکھ دیکھ کر اپنے حسن کا اندازہ لگا کر شرمانا ہی پڑا۔
سامنے سے بھیّا نظر آئے اور گیندا سرخ ہوگئی۔ ہم نے جلدی جلدی ماتھے کی بندیاں جھٹ ڈالیں۔ اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔
بھیّا مجھے ڈھکیل کر۔ گیندا کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ شرمانے لگی۔ بھیّا نے دانت پیس کر اس کے دونوں گالوں میں چٹکی لی۔ اور وہ "اوں۔ اوں" کر کے سکڑ گئی۔
"اسے ہے یہ کیا ہے؟" بھیّا نے نفرت سے پسی ہوئی اینٹ کی ڈھیری جوتے سے بکھیر کر کہا۔ ان کی اجلی قمیص بھی خراب ہوگئی۔ وہ اسی پر چڑھ بیٹھے تھے
"یہ تو سیندور ہے۔ ہم نے بنایا ہے" میں نے فخریہ کہا۔
بھیا انگلی سے سیندور سے کھیلنے لگے۔ اور اپنے پیر سے گیندا کا پیر دبایا
"لا میں تیرے لگا دُں۔ بھیّا نے سیندور لے کر گیندا کے لگا دیا
"اوں" اور اس نے ہتھیلی سے سیندور چھٹا دیا۔
"بھیا۔ گیندا تو بدھوا ہے۔ وہ سیندور کب لگاتی ہے" میں نے اپنی قابلیت جتائی۔
"لگائے گی کیسے نہیں چڑیل" اور انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے ڈھکیلا۔ اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔
"گیندا پھر میں تجھ سے بولوں گا بھی نہیں" اور گیندا نے آخر کو منہ کھول ہی دیا۔
"گیندا" بھیا نے اس کے قریب سرک کر کہا "بیاہ کرے گی؟"
"ہٹ" اور وہ شرما گئی۔

میں بھی حرص میں شرمانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم دونوں گھنٹوں بیاہ کی باتیں کر کے شرمایا کرتے تھے۔ بھیا کو تو وہ باتیں معلوم بھی نہ ہوں گی جو ہم نے آپا اور نھنی کو کرتے ہوئے پلنگ کے نیچے چھپ کر سنی تھی۔

" ہٹ کیسی "، بھیا نے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا " کرے گی بیاہ ؟ "

ہو کے چھپڑوں کی جھنکار سے ہم تینوں چونک پڑے۔ وہ کنوئیں پر آرہی تھی۔

" گیندا "، اس نے پکارا اور دوسرے لمحے ہمارے سروں پر آگئی۔

" ارے رانڈ، یہاں بیٹھی ہے۔ چل استری دہکا " وہ غرائی۔

گیندا جلدی سے کترا کر جانے لگی۔ مگر اس نے اسے لپک کر اسے جالیا اور بال پکڑ کر دو جھٹکے دئے۔

" اور یہ مانگ چوٹی تو نے کیسی کری ہے ؟ اس نے دھول مار کر کہا۔ گیندا غوطہ مار کر نکلی چلی گئی۔ میں اور بھیا تڑپ اٹھے۔

ہو سے میرے بدن میں آگ لگتی تھی۔ وہ جب گیندا کو مارتی، میں ضرور کچھ نہ کچھ اس کا نقصان کر دیتی۔ آج بھی جیسے ہی اس کی آنکھ بچی۔ میں نے مٹھی بھر کے راکھ اس کے صاف اور ستھرے کلف میں جھونک دی اور بھیا نے کالروں پر خراب استری کرنے کے تصور میں ننھا کے دو چھاپڑ کس کس کر لگائے۔

(۳)

" سونگھو " گیندا نے اپنی پھٹی ہوئی کرتی کا گریباں میری ناک سے لگا کر کہا۔

" سوں ... ... ہا! عطر! کہاں سے آیا ؟ میں نے بلبلا کر پوچھا۔

" بھیّا" اور وہ زور سے کھلکھلانے لگی۔ میں بھی رشک کو دبا کر ہنس دی۔
" گیندا " بھیّا نے برآمدے سے پکارا " یہ کوٹ ماسٹری کے لئے لے جا " وہ میری طرف معنی خیز نظروں سے مسکراتی ہوئی چلی۔

گیندا کیسے چلی جیسے پھلکی جا رہی ہو۔ میں جب چلتی تھی تو دھپا دھپ جیسے گھوڑا دوڑ رہا ہو۔ میں تو . . . . . . ادھو میرا جی گھبرانے لگا۔ اور میں چل کر باغ میں پانی دینے کی ہودی میں ایک لکڑی اٹھا کر گھنگولنے لگی۔ صبح کی پیسی ہوئی اینٹ کا سیندور اب تک وہیں پڑا تھا۔ بھیّا نے تو گیندا کے عطر لگایا۔ اور میرے لگانا شاید بھول گئے۔ بھول کیوں گئے جان کر ہی نہیں لگایا۔ حالانکہ ان کی سگی بہن ہوں۔ اور گیندا . . . . . . وہ تو ان کی کوئی بھی نہیں۔ مجھے بھیّا سے نفرت ہو گئی اور میں زور زور سے لکڑی گھمانے لگی۔

" ہاں ہاں۔ کیا کرتی ہو بی بی " میوہ رام نے پیچھے سے آ کر کہا۔

میں غور سے میوہ کو دیکھنے لگی " میوہ بھی تو میرا کوئی نہیں ! " میں نے سوچا مگر میں اس کے ہاتھ دیکھ کر اداس ہو گئی۔ کیا مجال جو یہ کمبخت ذرا اپنے ہاتھ مانجھ کر میل چھڑائے۔ ہر وقت مٹی کھودتا رہتا ہے۔ مگر خیر۔

" میوا " میں نے نرمی سے کہا " ذرا یہاں آ " ، اور میں غور سے لکڑی میں بنے بوند میں ٹپکتی ہوئی دیکھنے لگی۔

" کیا ؟ " وہ لاپرواہی سے مڑا۔ اور ٹوپی آنکھوں پر سرکا کر گدّی کھجانے لگا

" یہ . . . یہ سیندور میرے ماتھے پہ لگا دے " میں نے جرأتمندانہ لہجے میں حکم دیا۔

"یہ سیندور ہے" وہ کھی کھی ہنسنے لگا اور چلا مڑکر۔
"سن بھئی — میں تو — میوہ — ذرا ٹھہرنا!" ایک نئے خیالات کے ماتحت میں نے کہا۔
"کیا ہے بی بی؟" وہ ذرا مڑکر بولا۔
"میوہ ... بیاہ کرے گا؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا
"بیاہ! میرا بیاہ تو ہو بھی گیا!" وہ کھرپی کا دستہ پیڑ کے تنے سے ٹھوکنے لگا
"کب؟" میں نے مردہ آواز میں کہا۔
"ارے رام! مدتیں گزر گئیں" اس نے ایسے کہا گویا کوئی بات ہی نہیں
"اچھا تو تو بڈھا ہے" میں نے فیصلہ کیا۔
"ارے نہیں" وہ ہنسنے لگا "کون کوٹھریا میں مالن بیٹھی ہے"
"کیا مالن سے تیرا بیاہ ہوا تھا؟" میں نے حیرت سے کہا۔
"ہوں" اور وہ چل دیا۔
اچھا تو وہ بڑھیا جسے میں میوہ رام کی اماں سمجھتی تھی اس کی بیوی تھی
"کیسی عجیب دنیا ہے" میں نے سوچا۔ اور پھر ہودی میں لکڑی ڈال کر زور سے گھمانے لگی۔ . . . میں نے جھک کر اپنا گریباں سونگھا کہ شاید وہاں بھی کسی عطر کی خوشبو ہو۔ مگر دور دور کہیں خوشبو کا نام نہ تھا۔ ہاں صبح جو سالن گر گیا تھا البتہ اس کی بساندھ تھی۔ میں چڑ گئی۔

(۴)

گیند چپکے چپکے بھیا کے کمرے میں تولیہ میں لپٹے ہوئے کپڑے رکھنے

جا رہی تھی۔ میرے دل میں کھد بدی ہوئی اور دبے پاؤں بلی کی طرح میں بھی پیچھے پیچھے
اور دراز میں سے جھانکنے لگی۔

گیندا فرش پر بیٹھی کپڑے گن گن کر الگ کر رہی تھی۔ بھیا کونے میں کھڑے
سر کھجا رہے تھے۔

"ہٹ۔ غلط گن رہی ہے۔" بھیا نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اس نے
ایک نظر بھیا کو دیکھا اور تیوری پر بل ڈال کر ہنس دی۔ انھوں نے اسے کھینچا تو وہ سکڑ
کر دری پہ اوندھے منہ لیٹ گئی۔ اور کسی طرح نہ اٹھی۔ بھیا نے اس کی کمر میں جو گدگدی
کی تو تڑپ اٹھی۔ بھیا جو آگے آئے تو اس نے ایک تھپڑ ان کے گال پر رسید کیا۔
تعجب ہے کہ میں چونک کر نیچے نہ گر گئی۔" بھیا کے تھپڑ! جن کے خوف سے
سارا گھر لرزتا ہے۔ ان کے گیندا نے تھپڑ مار دی۔ میں بھاگنے کے لئے تیار ہو گئی
میں نے سوچا اب بھیا نے اس کا گلا گھونٹا۔ اور اب گھونٹا۔ انھوں نے لپکا کر
اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ میں نے سانس روک لی
... مگر .... ارے لو .... میں حیرت اور خوف سے ملے جلے جذبات سے مجروح
ہو کر سرپٹ بھاگی اور کمرخ کے گھنے درخت کے نیچے آ کر دم لیا۔ میرا کلیجہ بانسوں اچھل
رہا تھا۔ کانوں میں جیسے کوئی انجن چلا رہا ہو۔ بدن لرز رہا تھا۔ اور زبان خشک
تھی۔ میں دیر تک اسی طرح ڈری بیٹھی رہی۔

آنکھیں بند کر کے سوچا۔ اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوچا۔ مگر خاک
جو سمجھ میں آیا ہو۔ آخر کیوں میری سمجھ میں اتنی ڈھیر سی باتیں نہیں آتیں۔ خاموش
اور گرم دوپہر میں میں نڈھال ہو کر عجیب عجیب معموں سے لڑتی رہی۔ ایک بھی تو

حل نہ ہوا۔ رونا آنے لگا جیسے کسی نے مجھے خوب ہی تو مارا ہو۔

گیندا برآمدہ ہی سے لپک کر اتری۔ میں سمجھ گئی کہ میرے سوالوں کا جواب وہی دے سکتی ہے۔ گیندا مجھے کتنی باتیں بتاتی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" وہ مکاری سے اترائی۔ مگر فوراً ہی ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر ہم دونوں "عجیب عجیب" باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ گیندا نے افوہ! کتنی باتیں بتائیں۔

"ارے، مگر آخر کیوں؟" میں نے سب کچھ سن کر سوچا۔

گیندا کلف چڑھانے چلی گئی اور پھر میں ایسی بیٹھی رہ گئی، گویا راستہ گم کر دیا ہو میں نے چاہا کہ چھوٹی چھوٹی کرچیں بین کر ہار ہی بناؤں۔ یا پھر اس نالی کو پورا کروں جسے میں نے کل پانی دینے کے لئے کھودا تھا۔ یا پھر ایک نظر بالکری کی جھاڑی کے نیچے ڈال آؤں۔ یا نہیں تو لاؤ یہی معلوم کروں کہ "تیتری" نے انڈے کہاں دینے شروع کئے ہیں۔ مگر نہیں میرا دل کسی بات میں نہ لگا۔ نہ جانے کیوں ہر کھیل سے میرا جی اکتا گیا تھا۔ اور جی چاہتا تھا۔ چپکی آنکھیں بند کئے ہوئے کوئی خواب دیکھتی رہوں جس میں کوئی ننھی منّی دلھن ہو۔ اور پھر اسی خیال کی دنیا میں گم ہو جاؤں۔ آخر کیا کروں۔ گیندا کو دیکھو! مگر میں کیا کروں۔ میوہ کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور میں جیسے چونک پڑی۔ ایک خیال، ایک امید کی ہٹی ہوئی سی جھلک اور میں زمین پر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر اوندھی لیٹ گئی۔

"ہچ ... ہچ ہا — بی بی زمین پہ؟ اٹھو، اٹھو!" اس نے مجھے

دیکھ کر کہا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کوئی مجھے اٹھا رہا ہے، اور میں نہیں اٹھتی۔ میری پیٹھ میں کسی نے گدگدی سی کی ...... مگر ... اونہہ ....

"اٹھو نہیں تو کہتا ہوں بھیا سے کہ کپڑے میلے کر رہی ہیں۔" اس نے دھمکی دی اور ویسا ہی لٹھ کا لٹھ دور کھڑا رہا۔

وہ نہایت لا پرواہی سے بانس کی کھپچی چھیل رہا تھا۔ مگر اس انداز سے نہیں جیسے بھیا سر کھجا رہے تھے۔

"اٹھتی ہو کہ سچ مچ ہی جا کر کہہ دوں" اور وہ چلا شکایت کرنے۔ ذرا سوچئے میرا کیسا جی جلا۔

"سور، تو کون ہوتا ہے۔ آں۔ں" میں چنچنا کر کہا۔ اور ایک پتھر کس کے اس کے گھٹنے پہ کھینچ مارا۔

"ارے باپ ارے۔ ٹھہر تو جاؤ کیسا پٹواتا ہوں۔ دوپہر یا پھر گھام میں گھومتی ہیں اور رتیا میں لوٹیں لگاتی ہیں۔ جو کچھ کہو تو ..... ٹھہرو۔" وہ سی سی کرتا چلا "یہ کمبخت میوہ رام سدا کا کھٹس ہے۔ کیا مجال جو مجھ سے سیدھے منہ بات کر جاوے۔ بڑا ہی تو ہے نا!" میں ایسی جلی کہ موتیا کی ساری قلمیں جو اس نے گھنٹوں کی محنت کے بعد لگائی تھیں۔ ایک ایک کر کے کھسوٹ ڈالیں۔ ایسے انسان کا یہی علاج ہے۔ میں نے سوچا اور بسورتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

(۵)

کون تھا جو مجھ سے ہمدردی کرتا۔ بھیا نے تو کبھی منہ نہ لگایا۔ اماں نے

کبھی یہ لاڈ ہی نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلا کی ضدّی ہوگئی۔ طبیعت میں جو الجھن پیدا ہوئی تو سب سے ہی بیر باندھ لیا۔

باجی جواب کے آئیں تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میں دن بھر دا ہی تباہی گھومتی تھی۔ اور لڑتی پھرتی تھی۔ مجھے گیندا کے چھوٹنے کا بڑا افسوس تھا مگر سفر کی خوشی کچھ ایسی سوار ہوئی کہ سب کچھ بھول گئی۔

گیندا، بھیّا، میوہ اور ساری پرانی باتیں دو سال کے عرصہ میں خواب ہوگئیں۔ اور جب میں واپس آئی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بھیّا دہلی بھیج دیے گئے تھے۔ ان کے کمرے میں مہمان ٹھیرتے تھے۔ میوہ رام نمونیہ سے مر گیا تھا کیونکہ اس نے اپنی مٹی سے کھیلنے کی عادت نہ چھوڑی اور سردی لگ گئی۔ تعجب ہے کہ میں خوشی اور حیرت سے بیہوش نہ ہوگئی۔ جب میں نے سنا کہ گیندا کے بچہ ہوا تھا اظہار مسرت پر مجھے ڈانٹا گیا۔ میں خاک نہ سمجھی کہ کیوں؟ ہاں اتنا تو سنا۔

"اسے بہتیری تو اس نے کوشش کی۔۔۔ مگر وہ تو۔۔۔ آگے میں نے نہیں سنا کہ شیخانی نے کیا کہا۔

"اسے ہے وہ تو مارے ڈالتا تھا۔ بڑی آفتیں اٹھیں۔" بیوی نے کہا۔ "میں نے فوراً اسے دہلی چلتا کیا۔ پڑھنے والا بچہ! یہ نیچ ذات کمینیاں شریفوں کو یوں ہیں۔"

اور پھر باوجود سانس روک کے سننے کے میں آگے نہ سمجھ سکی۔

"گیندا کا بچہ!" میں بستر پہ لیٹی بار بار دہرانے لگی۔ مجھے حیرت پہ حیرت تھی مگر یہ بچہ!۔۔۔۔ آخر کیوں؟

"وہ تو اگر سرکار کو خبر ہو جاتی تو جانے کیا ہوتا۔ اسی لئے تو میں نے جلدی

سے اسے دفنان کیا۔" مجھے بیوی کی آواز کہیں سے سنائی دی۔

اب میں سمجھی، اور ہوا! میری نظروں کے سامنے ساری گزشتہ باتیں سینما کی تصویر کی طرح پھر گئیں۔ اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ لیکن فوراً ہی گیندا کے بچے کو دیکھنے کے لئے میں بے قرار ہوگئی۔ میری آنکھوں میں ننھا منا سا بچہ پھرنے لگا۔ جیسا ہم نے ریل میں لاہور جاتے وقت دیکھا تھا۔ ذرا سا بچہ مگر کتنا پیارا! ہمارے یہاں تو کوئی بھی بچہ نہیں۔ کوئی بچہ مہمان بھی نہیں آتا۔ مجھے گیندا کے بچے پر پیار آنے لگا۔ اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کے ننھے ننھے ہاتھ میری ٹھوڑی اور گردن پر رینگ رہے ہیں۔ میں چپکی لیٹی رہی کہ کہیں وہ چھوٹی چھوٹی فرشتوں جیسی انگلیاں میرے ہلنے جلنے سے بھاگ نہ جائیں۔

رات کو خواب میں بچے ہی بچے۔ سیکڑوں بچے۔ عجیب عجیب شکلوں کے گیندا کی شکل کے، میری شکل کے، بھیا کی شکل کے۔ یہاں تک کہ مرے ہوئے میوہ رام کی شکل کے سیکڑوں بچے۔ کلبل کرتے۔ کچھ بالوں دار۔ گول مٹول سر۔ ذرا ذرا سے ہاتھ۔ ریت کے بے شمار ذروں کی طرح ساری کائنات پر بکھرے ہوئے تھے۔

صبح میں چھپ کر گیندا کے بچے کو دیکھنے چلی گئی۔

(۶)

گیندا اپنی کوٹھری میں دروازے کی طرف پشت کئے جھکی ہوئی کچھ کر رہی تھی۔ میرے پیروں کی چاپ سن کر وہ چونک پڑی۔ اور ڈر کر مجھے دیکھنے لگی اور جلدی سے اس نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے۔ میں نے سامنے جا کر دیکھا تو ایک

مختصر ترین نیم برہنہ انسان اس کے گھٹنے پر پڑا ہوا اپنا کلھیا سا منہ پھاڑ رہا ہے
"اوئی کتنا منّا سا ہے" میں نے اس کے پاس اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا
گیندا کتنی دبلی ہوگئی تھی۔ جیسے لکڑی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے
میری طرف سے منہ پھیر لیا۔
"ہائے۔ جان ہے تیرا بچہ تو" میں نے خوشی سے چیخ کر کہا۔ اور زمین
پر بیٹھ گئی۔ جی چاہا گیندا اور اس کے بچّے کو اٹھا کر کلیجہ سے لگا لوں۔ مجھے نہ
جانے کیوں رونا آنے لگا۔
"ذرا مجھے دے گیندا" میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ مگر وہ خاموش بیٹھی
اپنے آنسو پوچھتی رہی۔
"ارے! رو رہی ہے تو!" مجھے تو رقت آنے لگی "ایک تو اتنا
گدّا بچہ ہے۔ اور پھر رو رہی ہے۔ لا مجھے دے۔
وہ سر جھکائے منہ پونچھتی اور بچے کو چھوا تک نہیں۔ میں نے چاہا
بچے کو گود میں لیلوں۔ اِی۔ اِی۔ وہ تو ایسا گلگلا جیسے گوشت کی بوٹی۔ اور کسی
طرح نہ اٹھا۔
"او گیندی، ذرا اٹھا دے" میں نے اپنے پر اسے خوشامدانہ لہجہ میں کہا
گیندا نے مجھے غور سے دیکھا۔ جیسے وہ میری آنکھوں میں کچھ تلاش
کر رہی ہو۔ شاید جو کچھ وہ ڈھونڈھ رہی تھی اسے مل گیا۔ اور اس نے ایسی
آسانی سے بچے کو اٹھا کر مجھے دے دیا کہ میں اس کی مشاقی پہ حیران رہ گئی۔
جیسے روئی کا گالا۔ ہلکا۔ پھلکا، دبلا سا بچہ!

میں اسے ٹاٹ پر لئے بیٹھی رہی۔ اور گیندا نے مجھے لاکھوں، کروڑوں عجیب عجیب باتیں بتائیں۔ کس طرح وہ مہینوں ماری گئی۔ چودہ پندرہ برس کی گیندا خود بھی بہت سی باتیں نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے کیسے بتاتی۔ ہم دونوں "کیوں"، "کیسے" "اور" "ارے" پر آکر رک جاتے۔

جب بہو کے کالا کلوٹا بچہ ہوا تھا جو کچھ دن بعد ہی مر گیا۔ تو کیسے گانے بجانے ہوئے تھے۔ بہو کو منوں گھی اور گڑ ٹھنسایا گیا۔ اور اب جو گیندا کا اتنا گورا سا بچہ ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ گیندا پٹی اور بہو کی رکھی گئی اور مرتے مرتے بچی تب یہ ننھا سا "للو" آیا۔ للو پاس دو ہی کرتے تھے۔ ٹھنڈ میں مرا جاتا تھا، رات بھر روتا تھا۔ بہوا سے ہر وقت کوستی تھی۔ کہ مر جائے تو چھٹی ہو جائے گیندا نے چپکے سے للو کے پیر میں کالا ڈورا بھی باندھ دیا تھا کہ کہیں اسے نظر نہ لگے اس نے صاف صاف اعتراف کر لیا کہ للو دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیارا ہے۔ اور وہاں میں بھی اور بھیا بھی۔ بھیا کے نام پر اس کی آنکھیں اپنی پرانی روشنی پر چمکنے لگیں۔ اور ان کا متواتر ذکر کرتی رہی۔

"وہ اب چھٹیوں میں بھی نہیں آتے؟"

"ہاں اب آئیں گے پارسال مسوری چلے گئے تھے۔ میں نے بچے کی انگلیاں گنتے ہوئے کہا۔

"تم انھیں چٹھی لکھوگی، کیوں بی بی؟" اس نے شوق سے پوچھا

"ہاں۔ ہاں"، میں نے زور سے سر ہلایا۔

"ہاں تو لکھ دینا کہ للو تمھیں بہت بہت سلام کہتا ہے اور بہت ہی یاد

کرتا ہے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ حالانکہ للّو چوں بھی کرنا نہ جانتا تھا۔

"اور یہ بھی لکھنا کہ اس کے لئے اب کے لال بنیائن لائیں جیسی بسنتی کا چھورا پہنے ہے۔"

"اور . . . یہ کہ . . ." اس نے شوق بھری نظروں سے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب کی بار چھٹیوں میں دو چار دن کے لئے ضرور آنا۔" جیسے وہ کسی سے التجا کر رہی ہو اور ہلکے سے ہنس دی۔ وہ نہ جانے کیا بکتی رہی اور میں للّو کے بالوں سے کھیلتی رہی۔

"دیکھ دیکھ گیندا کیسے چھوڑ رہا ہے . . . آ آ۔" میں نے انگلی میں گدگدی محسوس کر کے کہا۔

"بھوکا ہے۔"

گیندا شرما گئی۔

"لے بھئی نہیں تو رو دے گا پھر۔"

گیندا نے اپنے دبلے پتلے ہاتھوں سے بچے کو اٹھا لیا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے کلیجے سے چمٹا لیا اور ساڑھی میں منہ چھپا کر ہنستی رہی۔

میں بڑے اشتیاق سے ننھے للّو کے پتلے پتلے ہونٹوں کو دیکھتی رہی اور وہ لمبی لمبی سانسوں سے دودھ پیتا رہا۔ ننھی سی ماں پھوہڑپنے سے اسے سنبھال رہی تھی۔